کیا شکوہ کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ آسمان بہرا ہے چال اس کی ٹیڑھی ہے شعرائے کرام نے بلاوجہ بلا سبب تو اس کی مذمت نہیں کی تھی کچھ دیکھا تھا تب اسے فلک کج رفتار اور چرخ فتنہ پرور کہہ کر دل کا غبار نکالا تھا اور گنبد واژگوں کہہ کر پکارا تھا۔

میں نے وہ مخطوطہ الٹ پلٹ کر دیکھا مہجور نے کیسی کڈھب زبان لکھی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بیچ بیچ میں کوئی جواہر ریزہ آگیا ہے جس سے بیان کی قیمت بڑھ گئی ہے کوئی حکایتِ لذیذ کوئی داستانِ پارینہ، کوئی بصیرت افروز دوہا، کوئی حکیمانہ قول۔ مہجور آنجہانی کو عارفانِ ہند قدیم کے اقوال ازبر ہیں ان کی دانش سے اس نے بساط بھر استفادہ کیا ہے کاش اسے زبان پر بھی عبور حاصل ہوتا۔ شتر گربہ اس کی تحریر میں جابجا ہے۔ بہر حال فقیر نے بربنائے رفاقتِ دیرینہ سوچا کہ اس تذکرے کو بھی اپنے ہر تذکرے میں شامل کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے صحیح ہے کہ بیچ بیچ میں کلماتِ کفر آگئے ہیں مگر نقلِ کفر کفر نباشد۔ سو بعد غور و تامل کے تذکرہ مہجور سے تھوڑا حصہ اپنے یہاں نقل کر لیا۔

منقول از تذکرہ گنگادت مہجور

آرمبھ کرتا ہوں نام سے رام کے اور رحیم کے کہ وہی ستیہ ہے اور وہی حق ہے اور وہی سندر ہے اور اسی کی دیا اور کرم سے اس برہمانڈ میں اور اس عالم رنگ و بو میں ساری چہل پہل ہے جو ستیہ ہے وہ حق ہے، جو حق ہے وہ سندر ہے اللہ جمیل و یحب الجمال۔ حقیر فقیر گنگادت مہجور حمد کرتا ہے اس پیدا کرنے والے کی جس نے گائے کو پیدا کیا اور جس نے کوئل کو کوک اور مور کو جھنکار عطا کی۔ اور گائے کو ماتا کا درجہ دیا، دنیز تھنوں میں اس کے دودھ اتارا۔ اسی پالن ہار کی دیا اور کرم ہے کہ اس عالم

رنگ و بو میں بھن بھن پرکار کے مختلف انواع و اقسام کے پشو پنچھی وحوش و طیور چہکتے ہوئے چنگھاڑتے ہیں اور الوان و انواع کے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں اسی رنگا رنگی سے کائنات کو رونق ہے اور جگ میں اجیارا ہے۔ پورترم، منگلم، پرم۔ وہ پاک ذات ہے، مبارک ہے برتر و اعلیٰ ہے۔

سنو بھئی متر و اور عزیزو، باتمیزو، ایک بخش نے شہنشاہ والا صفات حضرت یدھشٹر مہاراج سے کچھ ٹیڑھے میڑھے پرشن پوچھے تھے اور سوالات عجیب کئے تھے ایک سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو گھاس سے بھی زیادہ ہے اس رمز شناس راجہ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے وچار ہیں سو بھئی متر و عزیزو، خیالوں وچاروں کی تنک سی گھاس میں نے بھی اکٹھی کی ہے میں نے بھگوت گیتا کا پاٹھ کیا، قرآن مجید کی تلاوت کی و نیز بید وں، پرانوں شاستروں ملفوظاتوں حدیثوں میں تانک جھانک کی۔ مزید برآں مہا کوی شری سعدی اور حضرت کبیر علیہ الرحمۃ کی حکایات و دوہا جات کا مطالعہ کیا۔ تب خیالوں وچاروں کی یہ تھوڑی گھاس جمع ہوئی ہے سو پہلے ان گیان بھری پتکوں اور مقدس کتابوں کو بندنا کرتا ہوں و نیز بوسہ دیتا ہوں۔ پھر عرض پرداز ہوتا ہوں اس جگ کو نستارنے کے لیے اور بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے ایشور اللہ کی اُدر سے کتنے سنت، سادھو رشی منی اوتار پیر پیغمبر مصلح اپدیشک آئے اور منش جاتی کے بیچ براجے اپدیش دیئے، سینہ پتھر بتایا، تبلیغ دین حقہ کی۔ مگر مرغے کی وہی ایک ٹانگ، بھول چوک کا پتلا، آدم کا بیٹا جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ مثل مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ برس تک دبا کے رکھی، مگر وہی ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلی۔

صاحبو سجنو! ویسے تو یہ سنسار اپنے پالن ہار کی کرپا سے بہت سندر ہے پر دکھ بھیانکر بھی ہے ایک اور سے سندر دوسری اور سے بھیانکر۔ ایک پرکار سے دیکھو تو یہ جیون ایک نغمۂ شادی ہے سکھ کی سیج ہے دوسرے زاویئے سے دیکھو تو یہ زندگی۔

دکھوں کی مالا ہے ذرا شادی وغم کے مقامات سے بلند ہو کر دیکھیں تو یہ عالم جگوں کا سلسلہ ہے برہمانڈ میں کال کا چکر چلا ہوا ہے ایک جگ جاتا ہے دوسرا جگ آتا ہے واضح ہو کہ جگ چار ہیں ست جگ، ترتیا جگ، دواپر جگ، کلجگ۔ جب ایک جگ کا انت ہوتا ہے تو محشر بپا ہوتا ہے صاحب العصر وازماں حضرت مارکنڈے رشی اس کے عینی شاہد ہیں کہ انہوں نے سنسار کو اسار دیکھا اور چار سو میں ہو کا عالم مشاہدہ کیا۔ آپ نے مشاہدہ کیا کہ بھومنڈل میں چاروں اور پانی ہی پانی ہے۔ جیو جنتو جاندار بے جان سب نابود ہو چکے ہیں۔ نہ نرناری نہ پشو پنچھی نہ شجر حجر نہ برکش نہ ڈال پات۔ ہر شے نشٹ ہو چکی ہے حضرت مارکنڈے جی ورطۂ حیرت میں غرق کہ بھومنڈل کہاں گیا، کائنات کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا' اور خود زمین و آسمان دھرتی آکاش کہاں ہیں' میں کہاں ہوں اسی گھڑی دیکھا کہ بیچ پانی میں ایک برکش برگد کا کھڑا ہے برگد تلے سنگھاسن بچھا ہے سنگھاسن پہ ایک ہنستا مسکاتا بالک کھیلتا کلکاریاں مارتا ہے مارکنڈے جی اسے دیکھ کے موہت ہو گئے۔ سدھ بدھ بھول گئے اسے تکے جاویں بالک بولا کہ مہامنی تم ادھک تھک گئے ہو تنک میرے سنگ آرام کرو۔ یہ کہہ کے بالک نے منہ کھولا۔ مارکنڈے جی اس کے سانس کے ساتھ کھنچے چلے گئے اور پیٹ کے اندر اتر گئے۔ اس پیٹ میں تو ایک دنیا آباد تھی ہماوت پربت، گنگا ندی، دوارکا، اجودھیا، کاشی۔ مارکنڈے جی نے لمبی یاترا کی۔ بھن بھن پرکار کے عالم دیکھے، دیس دیس کی خاک چھانی، پربتوں کی چڑھائی کی، سمدروں میں ہاتھ پیر مارے۔ پر عالم فانی کا اور چھور نہ ملا۔ مارکنڈے جی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ پھر گڑگڑائے کہ ہے نارائن دیا کرو۔ دفعتاً بادِ نسیم چلی اور حضرت مارکنڈے نارائن کے منہ سے نکل پڑے۔ نارائن کے وشال پیٹ سے باہر آئے تو دیکھا کہ وہی برگد کا برکش ہے وہی سنگھاسن' وہی ہنستا مسکاتا بالک۔ اس نے مسکا کے مارکنڈے جی کو دیکھا بس اسی آن مارکنڈے جی کو نئی درشٹی مل گئی۔ کیا دیکھا کہ کائنات پھر سے ظہور کر رہی ہے انڈے

کے بیچ سے پرکاشت ہو رہی ہے پوترم اُتکلم پرم۔

ہے متر و اور سلے یار و! سوچ اور وچار کرو کہ اب دنیا پر کونسا وقت آیا ہوا ہے سنسار میں ہاہاکار مچی ہے خلقت تراہ تراہ کر اٹھی۔ نگر خالی ہو رہے ہیں۔ کوچے اجڑ رہے ہیں انسانی رشتے بے وقعت ہو گئے نہ متر تا کا پاس نہ ہمسائیگی کا احساس۔ خون سفید ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی کا بیری۔ اولاد ماں باپ سے باغی مجھے دیکھو جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" جیون بھر میں نے شانتی کا کلمہ پڑھا۔ ایک ہی اپدیش دیا کہ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب آپس میں بھائی اور متر ہیں میرا بیٹا کشن لال الٹا وظیفہ پڑھتا ہے مثل تو یہ تھی کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے یہ سب کال کا چکر ہے اور وقت کی کرشمہ سازی ہے کتنے جگوں کا اسی پرکار خاتمہ بالخیر ہوا ہمارے جُگ کا بھی دیکھ لینا اسی طور انت ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ بس ہونے کو ہے قرائن تو یہی کہتے ہیں متر و، یہ دنیا زمانوں کا مدفن ہے اور جگوں کا مرگھٹ ہے اور جہاں جگ جل رہے ہوں وہاں آدمی کے تن کی کیا بساط ہے میں اپنی ہڈیوں کی مالا لئے بیٹھا ہوں۔ مگر کب تک اسے سنگھواؤں گا۔ آگ کی لپٹ آئے گی اور اسے بھسم کر دے گی جنم جنم سے یہی ہو رہا ہے کتنی بار جل چکا ہوں، کتنی بار اور جلنا ہے زمانہ آگ ہے اور ہم اس کا ایندھن ہیں۔

ہاڈ جلیں جیوں لاکڑی کیس جلیں جیوں گھاس

ایہہ تن جلتا دیکھ کے بھیو کبیرؔ اداس!

سنتو، غور کا مقام ہے اور وچار کی جائے ہے لکھو کھا برس سے اس دھرتی پہ یہی ہو رہا ہے جو ایک جاتک اس مضمون کی اپنے آنجہانی پتا سوم دت کی پوتھی سے نقل کرتا ہوں۔

دنیا شمشان بھومی ہے

بدھ دیو جی نے ایک دن بھکشوؤں سے یوں سمبودہ کیا کہ ہے بھکشوؤ! کان دھر کے سنو۔ اب سے لاکھ برس پہلے کی بات ہے کہ ایک سادھو نے ہمالہ پربت کی ایک اونچی چوٹی پہ دھونی رمائی تھی۔ ایک دن اس نے کیا دیکھا کہ اس سنسان چوٹی پر دو جنے بھٹکتے پھرتے ہیں ایک بوڑھا کھوسٹ اور ایک جوان۔ سادھو نے اچرج کیا کہ اس اجاڑ جگہ یہ جنے کہاں سے آ گئے۔ انہیں بلا کر پوچھا کہ بچہ تم یاں پہ کیا لینے آئے ہو۔ جوان نے کہا کہ یہ بوڑھا میرا پتا ہے اس کی اچھا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا کریا کرم ایسے استھان پہ ہو جہاں پہلے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔ تو ہم ایسے استھان کے کھوج میں یاں پہ آئے ہیں۔

سادھو نے پوچھا کہ بچہ پھر تمہیں ایسا استھان ملا جوان نے اتر دیا کہ ہاں مل گیا۔ سادھو ہنسا۔ کہا کہ بچہ وہ استھان میں بھی تو دیکھوں۔ جوان نے کہا کہ اوشیہ دیکھو اور وہ سادھو کو ایسی جگہ یہ لے گیا جو تین پہاڑیوں کے بیچ میں گھری ہوئی تھی لگتا تھا کہ یاں پہ کبھی کوئی مانو نہیں براجا ہے۔

سادھو اس استھان کو دیکھ کے ہنسا۔ بولا کہ مورکھ، تجھ سے پہلے بھی ایک شکتی شالی لمبی یاترا کر کے بڑے جوکھم کے بعد یاں پہ آیا تھا باپ کی ارتھی اٹھا کے لایا تھا اسی استھان پہ اس نے یہ سوچ کے باپ کا کریا کرم کیا کہ اس انگ تھلگ جگہ پاس سے پہلے کون مانو آیا ہو گا اس مورکھ کو کب پتہ تھا کہ اس کے پتا نے چودہ ہزار جنم لیے تھے۔ اور چودہ ہزار بار اس کا کریا کرم اسی استھان پہ ہوا تھا۔

جوان یہ سن کے سٹپٹایا۔ بولا، اچھا پھر میں دوسرا ایسا استھان کھوجوں گا جہاں پہلے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔

سادھو پھر ہنسا اور بولا کہ ہے پتر اس وشال دھرتی پر ایسا کوئی استھان نہیں ہے جہاں کوئی لاش نہ دبی ہو اور کسی مردے کی ہڈیاں نہ جلی ہوں ہے پتر یہ سنسار سارا شمشان بھومی ہے سو تو اپنے آپ کو مت تھکا۔ جہاں تیرا باپ پران چھوڑ دے وہیں پر اس کا کریا کرم کر دے۔

بدھ دیو جی اتنا سن کر چپ ہو گئے پھر مسکائے اور بولے کہ ہے بھکشوو بوجھو کہ وہ سادھو کون تھا۔ ہے انگی تابھ کون تھا وہ سادھو۔ ہے بھکشوؤ وہ سادھو میں تھا۔ بھکشوؤں نے یہ سن کے اچنبھا کیا۔ پوچھا کہ ہے تتھاگت اتنے سمے تم کہاں رہے بدھ دیو جی پھر مسکائے اور بولے کہ پھر میں نے بلی کا جنم لیا پر یہ جاتک میں تمہیں پھر کسی اور دن سناؤں گا۔

تو ہے سنتو اور اے بھلے مانسو، یہ سنسار تو ہے ہی شمشان بھومی۔ پر ہم اگیانیوں کو اس کا شعور نہیں ہے یہاں پر موت کا دور دورہ ہے، جم دوت کا ڈیرہ ہے فرشتۂ اجل ہر دم ہر سمے ہمارے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے باقی رہی زندگی تو حضرت کبیر علیہ الرحمۃ نے کیسے گیان کی بات کہی ہے۔ کہ

کبیر بیڑا جھوجرا پھوٹے چھیک ہزار
ہلکے ہلکے ترگئے، ڈوبے جن پر بھار

تو سنتو ہم تو ٹوٹے جہاز پر سوار ہیں جس میں ہزار چھید ہیں۔ منش کے جیون کا کیا اعتبار۔ جھوجرا بیڑا ہے کاچا سوت ہے تارِ نفس جانے کب ٹوٹ جائے۔ فرد کی کیا بساط ہے بھرے نگر حرفِ غلط کی مثال مٹ جاتے ہیں ایک دن یہ بندۂ عاجز مشتاق علی کو بتانے لگا کہ دوار کا کیسے نشٹ ہوا۔ مشتاق علی نے ہمیشہ کی طرح اپنے جلے کٹے لہجہ میں کہا کہ پنڈت تمہارے سری کرشن مہاراج نے اپنے نگر کو نہیں بچایا۔

میں نے کہا کہ مشتاق علی! یہیں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب نگر باسی پاپی نردئی دراچاری فاسق و فاجر ہو جاتے ہیں تو پیر پیغمبر رشی اوتار کوئی اس نگر کو نہیں بچا سکتا۔ پر وہاں تو ایک نگر ڈوبا تھا یہاں نگر نگر آگ لگی ہے جانو کہ جوالا مکھی پھٹ پڑی ہے بس اسی پرکار سب کچھ جل جاوے گا۔ اور سنسار بھسم ہو جاوے گا۔ جو حضرت مارکنڈے رشی نے دیکھا تھا وہ ہمیں دیکھنا ہے پر مارکنڈے جی نے تو نیا سنسار آرمبھ ہوتے بھی دیکھا تھا۔ ہمارے یہ بھاگ کہاں، ہمارے نصیبے میں تو خالی تباہی دیکھنی لکھی ہے۔

حضرت مارکنڈے رشی بھی کیا پیر فقیر آدمی تھے نے غم دنیا نے غم کالا، مست قلندر تھے۔ ہزاروں برس جیئے مگر مجال ہے کہ ایک بال بھی سفید ہوا ہو۔ سدا پچیس برس کے شکستی شالی نظر آئے۔ پر بھیا عمر کا زیادہ ہونا بھی آدمی کو بہت دکھ دیتا ہے میرے بزرگوار پتا پنڈت سوم دت آنجہانی سورگباشی نے اس مضمون کی ایک حکایت اپنی پوتھی میں درج کی ہے اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

بھوساگر میں اکیلا مانو

پانڈوؤں نے ایک بار مارکنڈے رشی سے پرشن کیا کہ رشی مہاراج آپ سے زیادہ بھی کسی مانو نے عمر پائی ہے اُتر دیا کہ ہاں پائی ہے بھلا کس نے۔ اندردمن رشی نے۔ مہاراج اندردمن رشی نے کتنی عمر پائی۔ پتر وا انہوں نے اتنی عمر پائی جس کی ورشوں شتابدیوں میں گنتی نہیں ہو سکتی۔ مہاراج انہیں اتنی لمبی عمر کیسے مل گئی۔ پترو، انہوں نے ایک بار لمبا جاپ کیا اس کا پھل انہوں نے یہ پایا کہ مانو لوک سے نکل کر دیو لوک میں جا براجے۔ ورشوں شتابدیوں کے چکر سے نکل کر سُتنتر ہو گئے پر ایک بار ان سے کچھ چوک ہو گئی۔ پھر اس دھرتی پہ ڈھکیل دیئے گئے۔ اندردمن نے پہلے تو بہت شوک کیا پھر یہ وچار کر کے من کو بہلایا کہ ہوں تو میں اس دھرتی ہی کا باسی۔ اپنے دیس چلتا ہوں اور سنگھیوں ساتھیوں

سے ملتا ہوں۔ سو وہ گھومتے پھرتے اپنے نگر پہنچے اور اپنے سنگھیوں کو ڈھونڈنے لگے پر کسی سنگھی کا کھوج نہ پایا۔ سے بہت بیت چکا تھا۔ سب سنگھی ساتھی مرکھپ چکے تھے۔ اندر دمن بہت دکھی ہوئے۔

ہے پانڈو! اندر دمن یہ سوچ کے بہت دکھی ہوئے کہ اب کوئی انہیں پہچانتا بھی نہیں۔ اس کھوج میں کہ کوئی پہچاننے والا ملے وہ نگر نگر گھومتے پھرے پر کوئی ایسا نہ ملا جو انہیں پہچانتا۔ کہیں ان کی مڈھ بھیڑ مجھ سے ہوگئی بولے کہ ہے مارکنڈے میں نے سنا ہے کہ تیری عمر بہت لمبی ہے تو تو مجھے پہچانتا ہوگا۔ میں نے کہا کہ رشی مہاراج میں اپنی دھن میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ نہ کسی استھان پہ ٹکتا ہوں نہ کسی مانو سے ہنستا بولتا ہوں۔ میں بھلا کیسے پہچانوں گا۔ اندر دمن رشی میری یہ بات سن کے اور بھی دکھی ہوئے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہے مارکنڈے، تجھ سے زیادہ عمر والا بھی کوئی ہے میں نے کہا کہ ہاں ہے۔ ہماوت کی چوٹی پہ ایک الو بیٹھا ہے اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے بولے کہ چل میرے سنگ چل کر اس الو سے پوچھتے ہیں کہ تو مجھے پہچانتا ہے وہ مجھے اوشیہ پہچان لے گا۔

پتر و! میں اندر دمن کے سنگ ہولیا ہم دونوں چلے الو کے پاس۔ چلتے چلتے ہماوت کی چوٹی پہ پہنچے دیکھا کہ الو ایک ٹھنٹھ پہ آنکھیں موندے بیٹھا ہے میں بہت شتابدیوں پہلے یاں پہ آیا تھا، اس سمے بھی وہ اسی پرکار آنکھیں موندے بیٹھا تھا تب سے اب تک اس نے آنکھ نہیں کھولی تھی ہم نے جب اسے پکارا تو مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ اندر دمن جی نے پوچھا کہ ہے الو میں اندر دمن ہوں۔ تو مجھے جانتا ہوگا۔

الو نے اندر دمن جی کو دیکھا کہا میں تو تجھے نہیں پہچانتا۔ اور پھر آنکھیں موندلیں اندر دمن جی الو سے یہ بات سن کے بہت دکھی ہوئے پہلے تو چپ ہی ہوگئے پھر انہوں نے الو سے ایک پرشن کر ڈالا ہے الو تجھ سے بھی زیادہ عمر کسی جنے کی ہے الو نے مشکل سے آنکھیں کھولیں کہا کہ ہاں ہے یاں سے پچھم کی اور ہزار کوس پر ایک تلیا ہے اس تلیا

کے بیچ ایک سارس کھڑا ہے اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے۔

اندردمن یہ سن کے بولے کہ ہے الو تو میرے سنگ چل۔ ہم چل کے اس سارس سے بات کرتے ہیں وہ مجھے ادشیہ پہچان لے گا۔

الو سنگ چلنے پہ تیار ہو گیا تب اندردمن، الو اور میں، تینوں مل کر چلے سارس سے ملنے کے لیے۔ مہینوں بعد سارس چونچ پروں میں دیئے آنکھیں موندے ایک ٹانگ پہ مہینوں بعد اس تلیا پہ پہنچے۔ دیکھا کہ بیچ تلیا میں ایک سارس کھڑا ہے۔ الو نے بتایا کہ سارس ان گنت شتابدیوں سے اسی پرکار آنکھیں موندے چونچ پروں میں دیئے ایک ٹانگ پہ کھڑا ہے۔

اندردمن نے پکار کے کہا کہ ہے سارس میں اندردمن ہوں سارس نے چونچ پروں سے نکالی آنکھیں کھولیں اور بولا کون اندردمن۔ اس پر اندردمن نے کہا کہ ہے سارس کیا تو اندردمن کو نہیں پہچانتا۔ میں اندردمن ہوں۔ سارس نے کہا کہ نہیں۔ میں اپنی تپسیا میں کھویا ہوا ہوں۔ مجھے کیا معلوم کہ تو کون ہے اور اندردمن کون ہے۔

بیچارے اندردمن پہ گھڑوں پانی پڑ گیا چپ کا چپ رہ گیا پھر ہمت کر کے پوچھا کہ ہے سارس تجھ سے زیادہ عمر بھی کسی کی ہے۔

ہاں ہے بھلا کس کی ہے؟ ہے مانو، اسی جھیل میں ایک کچھوا باس کرتا ہے اسکی عمر اتنی ہے کہ میں اس کے سامنے بالک کے سمان ہوں۔ ہے سارس، کچھوا بھلا وہ اس سمے کدھر ہے ہے مانو وہ کچھوا تو دیکھو کہ برسوں سے آنکھیں موندے تلیا کے اندر بیٹھا ہے اور اوم کا جاپ کر رہا ہے پر میں تیرے لیے اسے بلاتا ہوں۔

یہ کہہ کے سارس نے کچھوے کو پکارا۔ کچھوا سارس کے پکارنے پر تلیا سے باہر آیا اور بولا کہ ہے سارس تو نے کس کارن میری تپ میں بھنگ ڈالی۔

سارس نے کہا کہ ہے کچھوے ایک لمبی عمر والا مانو کالے کوسوں چل کر آیا ہے میں تو اسے پہچانتا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس کی عمر تجھ سے زیادہ ہو اس کا پتہ دے، وہ مجھے

پہچان لے گا تو مجھ سے زیادہ تو تیری ہی عمر ہے تو بتا کہ تو اس مانو کو پہچانتا ہے۔

کچھوے نے پوچھا کہ "بھلا اس مانو کا کیا نام ہے؟"

اندر دمن نے آگے بڑھ کر کہا کہ "ہے کچھوے میرا نام اندر دامن ہے میں اتنی شتابدیوں کے بعد پلٹ کے یاں پہ آیا ہوں کہ میرے سنگھی ساتھی سب مرکھپ چکے ہیں کوئی مجھے اب پہچانتا ہی نہیں۔ شاید تو مجھے پہچانتا ہو"

کچھوا اندر دمن کا نام سن کر چونکا۔ غور سے اندر دمن کو دیکھا اور ترنت پہچان لیا۔ پہچان لیا وہ رویا اور بولا کہ "ہے اندر دمن میں بھلا تجھے کیسے نہ پہچان کر تو نے جو گتیاں دان دی تھیں انہوں نے ہی تو کھر مار مار کے یہ تلیا بنائی ہے جس میں اب میں باس کرتا ہوں"

کچھوے کے یہ کہتے ہی دیو لوک سے ایک رتھ اترا۔ ساتھ میں ایک پکار آئی کہ ہے اندر دمن چل، چل کے دیو لوک میں اپنا استھان سنبھال۔

اندر دمن رشی رتھ میں بیٹھے ہمیں بھی اپنے سنگ بٹھا لیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس کے ٹھکانے پہ اتارا۔ پھر خود دیو لوک کو سدھار گئے۔

سو بھئی مترو، آدمی بھو ساگر میں اکیلا ہے یہ کائنات غیر جگہ ہے اور ہم اس میں اجنبی ہیں سویاں سے جلدی گذر جانے ہی میں عافیت ہے لمبی عمر کی آرزو میں خرابی ہی خرابی ہے سچی بات ہے مجھے تو یہ حکایت پڑھ کے بہت عبرت ہوئی۔ میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب یارِ عزیز مشتاق علی اس نگر سے ہجرت کر جائے اور عہد حاضر کی شبِ دیجور میں رنجور مہجور اکیلا رہ جائے پھر میں اندر دمن کی طرح اوروں سے پوچھتا پھروں گا کہ مترو تم مجھے پہچانتے ہو۔ اندر دمن کو تو انت میں ایک کچھوے نے پہچان لیا تھا۔ مجھے کون پہچانے گا۔ دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی آگے لگا تھا کہ سارا نگر

مجھے جانتا ہے اب لگتا ہے کہ یہ غیر جگہ ہے اور میں پردیسی ہوں۔ خود میرا بیٹا مجھے غیر جانتا ہے جان پہچان والے ایک ایک کر کے سب ہی چلے گئے بس ایک مشتاق علی نے زمین پکڑی ہے پر نتو وہ اس گھڑی بتیس دانتوں کے بیچ زبان کی سمان ہیں کل تک جو انہیں جھک کے ڈنڈوت کرتے تھے وہ اب انہیں پہچاننے سے انکاری ہیں جو دوستی کا دم بھرتے تھے اب وہ شترو بنے ہوئے ہیں۔ میری جاتی کے لوگوں کے ارادے ان کے بارے میں اچھے نہیں ہیں اور تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔ بیٹا تک میرے کہنے میں نہیں ہے دوسرے کیا سنیں گے خیر میں نے کچھ منتر جو میں نے آنجہانی پتاجی کی پوتھی میں لکھے دیکھے تھے مشتاق علی کو بتا دیئے ہیں۔ ذیل میں چند ایک نقل کرتا ہوں۔

شترو کو نشٹ کرنے کا منتر

اونگ، ہرینگ، سرینگ ـــــ یہ شبد آک کے پتے پہ لکھے اور گرم تندور میں جھونک دے۔ سات دن ایسا کرے شترو جل کر راکھ ہو جاوے گا۔

ایضاً

اونگ، بلونگ، بجرنگ بجرنگ، جے ہنومان کی ـــــ یہ شبد ببول کے کانٹے سے بھوج پتر پہ لکھے۔ بکھ کے بازو پہ باندھ لے شترو دیکھ کے ڈرے گا۔ کنی کاٹ کے نکل جاوے گا۔

ایضاً

م، مکٹ، سکٹ، مم منور تھے پورتی، مم چنتا چورتی۔ دہائی باسدیو کی۔ دہائی لونا چماری کی ـــــ یہ شبد پیپل کی لکڑی کی لیکھنی سے پتر پہ لکھ کے دوپہر کے سمے

چوکھٹ تلے دبا دیں۔ پھر اس گھر کے لیے کوئی جوکھوں نہیں ہے گھر والے بیریوں سے سرپچھت رہیں گے۔

آنجہانی پتا جی کا بیان ہے کہ یہ منتر آزمودہ ہے، پرمتر دوستو سب سے بڑا منتر تو اوم کے جاپ کا ہے۔ اوم کا جاپ ریلا ہے آدمی کیسے ہی سنکٹ میں ہو کیسی ہی مشکل میں ہو اوم کا ورد کرے، سنکٹ سے نکل آوے گا، مشکل دور ہو جاوے گی۔ سمجھو، ہمارا من ماچس کی ڈبیا ہے اوم کا کلمہ ماچس کی تیلی ہے تیلی کو ڈبیا پہ گھسو روشنی پیدا ہوگی، سارا اندھیرا دور ہو جاوے گا۔ مترو اور دوستو، میرا تو یہی ایمان ہے میرا روزانہ کا وظیفہ یہ ہے کہ سونے سے پہلے سو دفعہ اوم کا ورد کرتا ہوں اور تین دفعہ نادِ علی پڑھتا ہوں۔ اوم شانتی شانتی شانتی۔ یا علی۔ یا علی۔ یا علی۔

۸

اس بسنت پہ وہ مجھے بہت یاد آئی تھی بھی تو اس اپنے نئے گھر میں یہ میری پہلی بسنت۔ کتنے برسوں بعد میں نے بسنت کے اُجلے نیلے آسمان کو دیکھا کہ دھوپ سے بھرا تھا اور پتنگوں پرندوں سے جھلملا رہا تھا۔ کرائے والے مکان ایک پہلے مکان کو چھوڑ کر ہمیشہ اتنے تنگ میسّر آئے کہ آسمان سے ڈھنگ کی ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ اصل میں آسمان بھی تو ہمارے رہنے سہنے کے حساب کو دیکھ کر اپنے درشن دیتا ہے۔ جتنا آنگن اتنا آسمان۔ ابھی اپنے گھر کا آنگن اُجلا اُجلا تھا۔ چھت بھی بہت پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ گھر کے اس اُجلے اور کشادہ گردوپیش میں بسنت کا آسمان کتنا روشن کتنا کشادہ نظر آرہا تھا۔

بسنت کی اس جھلمل میں حافظہ کے دریچے کتنی تیزی کے ساتھ کھلتے چلے گئے بیتے دنوں کی مہک اپنے بہاؤ میں میرے تتر بتر ریزوں کو بھی لے آئی۔ میں پھر سے اکٹھا ہو رہا تھا۔ لگا کہ وہی میں ہوں جو ہوا کرتا تھا اور وہی یہ دن ہیں۔ وہ بالکل اسی رنگ کا بسنتی دن تھا۔ ہوا میں حرارت اور خنکی کا ایسا ہی گھال میل تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اُٹھایا۔ وہ بول رہی تھی۔ بسنت کی ترنگ میں میری بھی زبان کھل گئی۔ پہلی بار تکلف کو بالائے طاق رکھا۔ "شہزادی کی جوتی اپنا کام دکھا چکی ہے اسے

اب واپس لے ہی لیا جائے تو اچھا ہے۔"

"شہزادی کی جوتی؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے اس حسین قلم کو بہت سنبھال کر رکھا۔ یہ امانت اب مجھے مجھے بھاری پڑ رہی ہے۔ اب تم آکر اپنی امانت لے جاؤ۔ یہ وقت بھی مناسب ہے۔"

"مناسب وقت سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ اگر یہ موسم گذر گیا تو پھر ساون رت تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ وہی تباہکن ہنسی۔ میں ساری فقرہ بازی بھول گیا۔ پگھلتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ پھر فون درمیان سے سرک گیا۔ بس وہ تھی اور میں۔ وہ بالکل بسنت کی طرح کھلی ہوئی۔" اچھا کل۔"

"کل؟ .... واقعی؟" مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

جیسے کھلکھلاتی ہنسی ایک دم سے سرگوشی بن گئی ہو۔

"ہاں کل۔"

"آج چھٹی کا دن اونگھ کر ہی گذارنا ہے۔" زبیدہ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی وہ خود آن موجود ہوئی۔

"کیوں، کیا مسئلہ درپیش ہے۔" میں یادوں کی اقلیم سے کتنی تیزی سے لوٹتا ابھرتا واپس آیا۔

"میں نے کہا کہ آج چھٹی کا دن ہے۔ ہاؤسنگ والوں کا حساب آیا رکھا ہے۔ ذرا اسے چیک کر لیتے۔ یہ بھی پتہ چل جاتا کہ ہم اب تک کتنا ادا کر چکے ہیں۔"

"کل پرسوں کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔"

"آج کیا بے اطمینانی ہے۔"

"بے اطمینانی تو کوئی نہیں ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ آج بسنت ہے۔ دیکھ

نہیں رہی ہو آج آسمان پہ کتنی چہل پہل ہے۔"

"یہ بسنت سے زیادہ ضروری کام ہے۔ پتہ تو چلے کہ انہوں نے حساب ٹھیک بھیجا ہے۔ کم زیادہ تو نہیں کیا۔ محکمہ والوں کا کوئی اعتبار تھوڑا ہی ہے۔ کیا پتہ ہے۔ ہمارے حساب میں کس وقت کتنی رقم نکال دیں۔ جو دینا ہے وہ تو دینا ہے ہی۔ مفت کی چپتی تو نہ پڑے۔"

بس جیسے آنگن میں اُتری ہوئی چڑیوں کو کوئی ہش کہہ کے اُڑا دے۔ اِن چار فقروں نے یادوں کے جمگھٹے کو تتر بتر کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ایسے ہو گیا جیسے اندر سے بالکل خالی ہوں۔ خیر تھوڑی ہی دیر میں یادیں پھر اترنے لگیں۔ آنگن پھر بھرتا چلا گیا۔ اب میری نظریں آسمان سے اُتر کر اس گیندے پر ڈول رہی تھیں۔ جولان کے ایک دھوپ سے بھرے گوشے میں کھڑا ہنس رہا تھا۔ یادوں نے اس گیندے سے اشارہ لیا اور ہجوم کرتی چلی گئیں۔ ہر پھر کر وہی یاد جو اس ہجوم میں سب سے نمایاں سب سے روشن تھی۔

"ٹھیک ہے کل سہی۔ بسنت رُت تو کل بھی ہوگی۔ مگر یہ نہ ہو کہ کل کسی اگلی کل پر جا پڑے۔ اس اگلی کل آنے پر پھر کوئی اگلی کل۔"

پھر ہنس پڑی۔ "نہیں۔ کل کا مطلب ہے کل۔"

"کل کس وقت؟"

"بس لنچ ٹائم میں آجاؤں گی۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "اچھا تو کسی دفتر میں کام کرتی ہو۔"

یہ بات جیسے سنی ہی نہیں۔ صاف گول کر گئی۔ "بس کل ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، مگر وہ لنچ کا وقت ہوتا ہے۔ ویسے میرا تو ڈراٹی لنچ ہوتا ہے۔

کافی ہاؤس میں جا کر کرتا ہوں۔ اچھا ہے کافی کی پیالی پر ملاقات زیادہ بھلی لگتی ہے۔"

تھوڑے تامل کے بعد "اچھا ٹھیک ہے۔ وہیں آجاؤں گی۔"

"مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟"

"رتن نے پدم کو کیسے پہچانا تھا۔"

"اس نے تو پدم کو خواب میں دیکھا تھا۔"

"آپ نے ابھی تک مجھے خواب میں نہیں دیکھا۔" ساتھ ہی کھنکھناتی ہنسی۔ فوراً ہی ایک فقرہ اور لگا دیا۔ "اور ہاں طوطا بھی تو ہوگا۔"

میں بالکل لاجواب ہوگیا۔

"مگر میرا گائیڈ تو کوئی طوطا نہیں ہوگا۔ میں آپ کو کیسے پہچانوں گی۔"

"بہت آسان طریقہ ہے۔ کاؤنٹر پر میرا نام لے کر پوچھ لیجئے۔ میں بھی کہہ رکھوں گا کہ ایک بی بی ذکیہ احمد نام کی آئیں گی۔ ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں نے کہا کہ کان بند کر کے بیٹھے ہوتے ہو۔" زبیدہ کی آواز آئی اور ایک مرتبہ پھر چڑیاں بھرا کھا کے اڑ گئیں۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"دروازے پہ کوئی ہے۔ بیل بجی ہے۔"

"اچھا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر دروازہ کھولا۔ کامریڈ کھڑا تھا۔ "کامریڈ، تم اس وقت کہاں سے آن ٹپکے۔"

کامریڈ اندر آیا۔ اپنے پرانے دستور کے مطابق کتابوں رسالوں اخباروں سے بھرا تھیلا ایک طرف رکھ کر کرسی صوفہ سے کنارہ کر کے قالین پہ پسر گیا۔

"یہ وقت کی کیا شرط ہے۔ کیا غلط وقت پہ آیا ہوں۔ ویسے تو ہر وقت ہی

غلط وقت ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں سالا ٹھیک وقت کب آئے گا۔"

"بہر حال آ گئے۔ اچھا کیا۔"

"کیا کر رہے تھے؟"

"بسنت منا رہا تھا۔"

کامریڈ نے اوپر سرسراتی پتنگوں پر نظر ڈالی۔

"پھر تو تمہیں چھت پہ ہونا چاہیے تھا۔"

"نہیں بس اپنے لان میں بیٹھا تھا۔ بھولتے گیندے کو دیکھ رہا تھا اور گذرے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ یار، وہ اچھے دن تھے۔"

کامریڈ نے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھا۔ "اچھے دن؟ وہ کونسے دن تھے۔"

"جن دنوں ہم اکٹھے تھے۔"

"چار رجعت پسند اگر اکٹھے ہو جائیں اور بورژوا ادب پہ دھواں دھار باتیں کر کے وقت ضائع کریں تو وہ دن اچھے ہو جاتے ہیں؟

"کامریڈ مت بھولو کہ اس منڈلی میں تم بھی تھے اور تمہارا کامریڈ ظہور بھی تھا۔"

"کامریڈ ظہور" کامریڈ نے دانت کچکچائے۔ "ان سالوں ہی نے تو پارٹی کا بیڑا غرق کیا۔" رک کر اور وہ سالا کامریڈ شوکت۔ ایکسپورٹ امپورٹ کے لائسنسوں کے چکر میں پارٹی کا تیا پانچا کر دیا۔ انقلابیوں کا سرخیل بنا پھرتا تھا۔ اب سمگلر کنگ ہے۔"

میں نے کامریڈ کا ہاتھ پکڑا۔ "ذرا باہر چل۔" اسے لے جا کر لان میں کھڑا کر دیا۔ اپنے گیندے کی طرف اشارہ کیا۔ "کامریڈ، آج بسنت کا دن ہے۔ میں تمہاری انقلابی بکواس سننے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔ آج اپنے گیندے سے میرے مکالمے کا دن ہے۔"

"کامریڈ، تم مریض ہو۔ اپنا علاج کراؤ۔ جو عوام کے ساتھ مکالمہ کی ہمت نہیں رکھتے پھر وہ گیندے اور گلاب ہی سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اس مکالمہ میں کوئی جوکھوں جو نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم آج زیادہ ہی کہیں سے پٹ کر آئے ہو۔ آرام کرو۔ ذرا شام ہو تو ممتاز کے پاس چلیں گے۔"

"ممتاز سے تمہاری ملاقات ہو گئی؟"

"ہاں ہوئی تو تھی۔ یار وہ تو اب بہت مصروف آدمی ہو گیا ہے۔"

"جو سالا پیسہ کما لیتا ہے اس سالے کا وقت پھر بہت قیمتی ہو جاتا ہے۔"

"بہر حال آج اس سے ملاقات کی ٹھہری ہے۔ کہنے لگا کہ پروگرام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یار کبھی ہم پہلے پروگرام طے کر کے ملے تھے۔ بس مل کر بیٹھیں گے باتیں کریں گے۔ پرانے دنوں کو یاد کریں گے۔ بقدر توفیق رتجگا کریں گے۔"

کامریڈ نے ایک مرتبہ پھر میری مریضانہ ذہنیت پر بھرپور تبصرہ کیا اور اندر ڈرائینگ روم میں جا کر قالین پہ لوٹ لگانے لگا۔ وہ اندر خراٹے لے رہا تھا اور یہاں میں گیندے کے روبرو اپنے خیالوں میں گم تھا۔ سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہاں سے پھر مل گیا تھا۔

"یار ممتاز، آج کل مجھے ایک لڑکی ٹکری ہوئی ہے۔"

ممتاز ہی سے میں دل کے معاملات کہتا تھا کہ اسی پر مجھے ان معاملات میں اعتبار تھا۔

"جب تم اسے ٹکرو گے تب ہم جانیں گے۔"

"وہ نہیں یار۔ یہ ایک اور لڑکی ہے۔"

"اچھا؟ کوئی نیا چکر۔ یہ چکر کیسے شروع ہوا؟"

"کوئی چکر وکر نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ آج کل میرا اسکوٹر خراب ہے۔ ویگن سے دفتر آتا جاتا ہوں۔ تو جب میں صبح کو نکلتا ہوں اور سٹینڈ پر جا کر ویگن کا انتظار کرتا ہوں تو وہاں ایک بے چین رُوح نظر آتی ہے۔ بار بار اپنی گھڑی دیکھتی ہے۔ جیسے اپنی گھڑی پر اسے اعتبار نہ ہو، میرے پاس آتی ہے۔ پہلے پوچھے گی کہ آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے۔ پھر پوچھے گی کہ ویگن کا تو یہی ٹائم ہے نا ــــ "جی" ــــ "پھر کیوں نہیں آئی ابھی تک" ــــ

"پتہ نہیں" ــــ "کہیں آ کر چلی تو نہیں گئی" ــــ "میرے خیال میں تو ابھی نہیں آئی ہے" ــــ "آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں"

"یہی کوئی آدھ گھنٹے سے" ــــ "اچھا، پھر ٹھیک ہے"

"بہت سوال کرتی ہے"

"ابتدا تو اچھی ہے۔ ویسے شکل وصورت کیسی ہے"

"یار شکل وصورت کی تو بُری نہیں۔ مگر بور ہے یا اس کے سوالوں سے میں بور ہو گیا ہوں"

"اور تم کوئی سوال نہیں کرتے"

"نہیں"

"کچھ نہیں پوچھتے"

"نہیں، میں کیا پوچھوں"

"کوئی بھی بے معنی فضول لایعنی سی بات پوچھی جا سکتی ہے۔ بات جو کرتی ہوئی"

"نہیں، میری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں۔ سو میں تو اُس سے کچھ پوچھتا وچھتا نہیں"

"پھر بور تو تم ہوئے"

"یار، میرے دماغ میں تو وہ بسی رہتی ہے۔ اب اس کے ہوتے ہوئے تو مجھے سب لڑکیاں بے معنی نظر آتی ہیں۔"

"پھر اسی کے متعلق کچھ کرو۔"

"کیا ہے۔ کل ملاقات ہو رہی ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"گڈ۔"

اور دوسرے دن لنچ کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں دفتر سے نکل لیا کہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرے پہنچتے پہنچتے آ کر چلی جائے۔ انتظار کرنے والے بھی کتنے عجلت پسند ہوتے ہیں۔ یوں پوری عمر انتظار میں گذار دیں۔ خیر لنچ ٹائم سے پہلے ہی میں موقعہ واردات پہ پہنچ لیا۔ ایسی میز سنبھالی اور ایسے زاویے سے بیٹھا کہ دروازہ کھول کر جو بھی اندر آتا وہ صاف نظر آتا۔ دروازے کے برابر کاؤنٹر تھا۔ روز کی طرح آج بھی اشرف صاحب کہ کافی ہاؤس کے مینجر ہیں۔ کاؤنٹر پہ بیٹھے تھے۔

لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ دروازہ بار بار کھلتا۔ آنے والے آتے چلے جا رہے تھے۔ مگر مجھے باقیوں سے کیا لینا تھا۔ میں تو اس وقت چونکتا تھا جب کوئی لڑکی داخل ہوتی تھی اور ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر میں شک میں پڑ جاتا کہ شاید یہی وہ ہے۔ وہ قریب آتی جاتی اور میرے دل میں دھکڑ پکڑ ہونے لگتی۔ مگر میرے قریب سے گذر کر وہ سیڑھیوں پر ہو لیتی اور اوپر کی منزل پر چلی جاتی۔ ایک خوبصورت لڑکی جب داخل ہو کر ٹھٹکی اور کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے کچھ پوچھنے لگی تو میں نے سوچا کہ یہ لڑکی ضرور وہی ہوگی۔ مگر اشرف صاحب نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ سونتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

پھر ایک لڑکی نے داخل ہو کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی اشرف صاحب سے